غلبۂ دین کا راستہ

اگست، ستمبر ۲۰۲۱ء کے شمارہ سے ماخوذ

مولانا محمد مثنی حسّان

نوائے غزوۂ ہند

غلبۂ دین کا راستہ

مولانا محمد مثنیٰ حسّان

[امارتِ اسلامیہ کی جدوجہد کی روشنی میں...غلبۂ دین کی تحریکات سے وابستہ بھائیوں سے خطاب]

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله وعلى آله وصحبه ومن والاه، وبعد

امیر المؤمنین ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۹۱ء میں افغانستان میں جس تحریک کی بنیاد رکھی تھی، اس نے پانچ سالوں کے مختصر عرصہ میں افغانستان کے بیشتر علاقوں میں تمکین حاصل کی اور شرعی امارت قائم کی، جو مزید پانچ سال تک قائم رہی۔ جدید دور میں یہ واحد اسلامی تحریک... دوسرے لفظوں میں غلبۂ دین یا اقامتِ دین کی تحریک... تھی جو عملاً غلبۂ دین میں کامیاب ہوئی، اور تحریک سے بڑھ کر تمکین و غلبے کے مراحل تک پہنچی۔ ۲۰۰۱ء میں ۱۱ ستمبر کے حملوں کو بہانہ بنا کر امریکہ نے افغانستان کی اسلامی امارت کے خلاف حملہ کر دیا، جس سے امارت کا سقوط ہو گیا۔ امیر المؤمنین ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زمین کی بازیابی اور امارت کی بحالی کے لیے امریکہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، اور بیس سال کے جہاد کے بعد آج ایک مرتبہ دوبارہ افغانستان میں امیر المؤمنین شیخ ہبۃ اللہ اخندزادہ حفظہ اللہ کی زعامت میں امارتِ اسلامیہ نے تمکین حاصل کر لی ہے، اور دوبارہ شرعی احکامات نافذ کر کے دنیا میں اسلامی حاکمیت کی حامل واحد اسلامی ریاست کو وجود بخشا ہے۔

یقیناً عالمِ اسلام کے لیے یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے، دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں اور جماعتوں نے امارت کی تائید کی ہے، اسے سراہا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ آج کی دنیا میں کوئی بھی مسلمان امارت کے مجاہدین اور ان کی جدوجہد سے صرفِ نظر کر سکے یا اسے نظر انداز کر سکے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ یہ واحد تحریک ہے جو اپنی پوری جدوجہد میں تمکین کے مراحل تک سو فیصد کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے، لہٰذا موجودہ دنیا کے کسی بھی خطے میں برسرِ عمل غلبۂ دین کی تحریک کے لیے اس تجربے سے استفادہ نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی، بلکہ آج غلبۂ دین کی تحریک کے ہر کارکن اور اقامتِ دین

کے ہر داعی پر لازم ہے کہ وہ اس جدوجہد کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائے اور اپنی جدوجہد کو اس کے آئینے میں پرکھے، اور ضروری اصلاحات کو اپنائے۔

زیرِ نظر مضمون میں ہماری یہی کوشش ہے کہ ہم امارتِ اسلامیہ کی تحریک کے ضروری عوامل کو بیان کریں اور اسے دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے سامنے پیش کریں۔ مضمون کی تفصیل میں اترنے سے قبل ہم یہ وضاحت دیتے چلیں کہ یہاں ہم وہ بیان کریں گے جو امارت کی ابھی تک کی جدوجہد کو سامنے رکھتے ہوئے ہم سمجھے، اور ہمیں دینی احکامات کے مطابق درست معلوم ہوا، اور اسے ہم دیگر خطوں کی تحریکات کے لیے مفید اور صائب سمجھتے ہیں، ممکن ہے کہ کوئی اس سے اختلاف کرے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ نصوصِ شرعیہ برحق ہیں، جنھیں من وعن بیان کر دینے میں بیان کرنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کی جانب سے کوئی بات داخل نہیں ہے، لیکن اس کے برخلاف نصوص کی تشریحات میں ہی بیان کرنے والے کی آراء کا دخل ہو جاتا ہے جس کے سبب اختلاف کی گنجائش نکل آتی ہے، پھر معاملہ جب فقہ الواقع کا ہو تو کیسے کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کی رائے ہی برحق ہے اور اس کے علاوہ غلط ہے۔ ہاں! ہمارے دل میں یہ داعیہ ہے کہ اے کاش! دنیا کے دیگر خطوں میں بھی ہم غلبۂ دین کی جدوجہد کو تحریک سے بڑھ کر تمکین کی شکل میں دیکھیں، اور اسی کے نشانِ راہ متعین کرنے کے لیے ہم یہاں گزارشات کرنا چاہتے ہیں۔

کسی بھی انسانی عمل کے پیچھے کسی فکر کو دخل ہوتا ہے، اور وہ فکر کسی طرزِ فکر کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ یعنی کسی بھی عمل کے اندر تین عوامل پائے جاتے ہیں؛ طرزِ فکر، فکر اور نفسِ عمل۔ چونکہ ہمارا موضوع غلبۂ دین کا عمل ہے، اس لیے ہم انھی تینوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر امارتِ اسلامیہ کی غلبۂ دین کی جدوجہد کا جائزہ لیتے ہیں۔

طرزِ فکر

سب سے پہلی اور بنیادی بات جو امارتِ اسلامیہ کو دیگر تحریکات سے ممیز کرتی ہے، وہ دین کی بابت ان کا طرزِ فکر ہے۔ وہ طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ دینی احکامات کے معاملے میں اپنے آپ کو قرونِ اولیٰ کے فقہاء کا پابند سمجھتے ہیں، بالخصوص مذہبِ حنفی کی تعبیرات کا۔ انھوں نے ایسے مسائل میں... جن میں فقہائے متقدمین کا اجتہاد پایا جاتا ہے... اجتہاد کا دروازہ نہیں کھولا، بلکہ اتباع کا راستہ اپنایا۔ کسی بھی غلبۂ دین کی تحریک کے لیے یہ بہت بنیادی نکتہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جب بحیثیتِ مجموعی مسلمان مغلوب ہیں، اور دنیا میں کفار کا غلبہ ہے، اور ان کے وضع کردہ نظام ہائے زندگی رائج ہیں، ایسے میں ہمیں دین کے بہت سے 'جوہری' مسائل ملتے ہیں جن میں غالب پیراڈائم [paradigm] اور مجتہدین کے اجتہاد میں موافقت کا نہیں، بلکہ مناقضت کا تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے اصلاح کے نام پر اٹھنے والی بہت سی تحریکات نے ان مسائل میں... جو معاشرت، معیشت، جنایات یا حکمرانی تک سے متعلق تھے... 'ضرورت' کے نام پر قدیم فقہاء کے اجتہادات کی مخالفت کے باوجود 'جدید' اجتہاد کیا، اور غالب پیراڈائم کو 'اسلامیانے' کی کوشش کی۔ اس کام سے دو نتیجے بر آمد ہوئے۔ اول: دینِ اسلام کے وہ خدوخال جو اہل السنۃ کے یہاں واضح تھے، اور مجتہدین کے خط کشیدہ تھے، اس میں تبدیلی آنے لگی، اور اس کے مخالف اسلام کے جدید خدوخال متعین ہونے لگے، یوں غلبۂ دین کا مفہوم بدل گیا۔ دوم: غلبۂ دین کی جدوجہد غالب نظام کی حدود کے اندر بند ہو کر رہ گئی، قدیم مجتہدین کے اجتہاد پر عمل کر کے غالب نظام سے تصادم کرنے اور اس کی جگہ قدیم مجتہدین کے بیان کردہ احکامات کو رائج کرنے کی فکر ختم ہو گئی، اور یوں غلبۂ دین کے راستے کے تعین میں بھی قدیم مجتہدین کی مخالفت ہو گئی۔ یہ نکتے آگے مزید وضاحت سے آئیں گے۔

یہاں یہ واضح کرنا تھا کہ آج کے دور میں غلبۂ دین کی جدوجہد کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کردہ دین کی جو تعبیرات غلبۂ اسلام کے دور میں مجتہدینِ اسلاف نے بیان کی ہیں، ان سے تمسک کیا جائے، اور

انھی کے آگے سر جھکایا جائے۔ اس کی ایجابی اور سلبی کئی وجوہات بیان کی جاسکتی ہیں، لیکن یہاں ہم دو ایجابی [positive] اور ایک سلبی [negative] بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں: پہلی یہ کہ مجتہدینِ اسلاف کا دینِ اسلام سے تمسک اور فہم میں تصلب آج کے دور کے مسلمانوں سے یقیناً بہتر تھا۔ بلکہ اس تعلق کو بیان کرنے کے لیے بہتر کا لفظ تو بہت چھوٹا ہے، یعنی کوئی موازنہ ہی نہیں ہے، دوسری یہ کہ مجتہدینِ اسلاف نے جس زمانے میں احکاماتِ دینیہ مدون فرمائے، وہ اسلام کے غلبے کا زمانہ تھا جہاں وہ احکاماتِ دینیہ کے استنباط میں کسی 'غیر اسلامی' غالب قوت کے اثر سے محفوظ تھے، اگر کہیں مسلمان حکمرانوں نے جبر سے بھی کام لیا تو ان مجتہدین نے ان سے دبنے کی بجائے مزاحمت کی راہ اپنائی، خود ظلم برداشت کیا، مگر دینی احکامات کو ظالموں کے زیرِ اثر تبدیلی سے محفوظ رکھا، سلبی وجہ یہ ہے کہ آج کے دور میں جو تحریکات ایسے جدید اجتہاد کی قائل ہوئیں، اور اس پر عامل ہوئیں، نتیجے میں یہ مفسدہ پیدا ہوا کہ غلبۂ دین کی منزل سے محروم رہیں۔

اچھا! ہمارے اس نکتے سے کوئی فرد یہ نہ سمجھے کہ اجتہاد کا دروازہ مطلق بند کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ نہیں! ہم یہ نہیں کہہ رہے اور نہ ہی امارتِ اسلامیہ کا یہ موقف ہے، بلکہ چونکہ وہ مجتہدین اور چودہ سو سالہ فقہی محنت کے پاسبان ہیں، اسی لیے اس باب میں ان کا وہی موقف ہے جو فقہائے امت آج تک بیان کرتے آئے، یعنی ایسے پیش آمدہ مسائل جن میں قدیم فقہاء کا کوئی اجتہاد نہیں پایا جاتا، ان میں 'اجتہاد' ناگزیر ہے۔ اسی کو ہمارے قدیم فقہی ذخیرے میں 'نوازل میں اجتہاد' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہماری اوپر کی بحث کا تعلق ان مسائل میں اجتہاد سے ہے جن میں فقہائے امت کا اجتہاد پہلے سے موجود ہے، لیکن آج جب ہم غالب نظام کی وجہ سے اس اجتہاد پر عمل نہیں کر پاتے تو اس اجتہاد کو مسترد کر کے نیا اجتہاد کر لیتے ہیں اور اپنے لیے اس نظام میں جگہ بنا لیتے ہیں۔

اس بحث میں مزید تفصیل میں اترتے ہیں۔ موجودہ غلبۂ دین کی تحریکوں میں اس بابت طرزِ فکر ایک سا نہیں ہے اور نہ ہی طرزِ فکر کے اختیار کے اسباب ایک سے ہیں۔ کہیں یہ طرزِ فکر ہے کہ ہر مسئلے میں قرآن و سنت سے براہِ راست استفادہ

کیا جائے۔ کہیں یہ طرزِ فکر ہے کہ قدیم فقہی ذخیرہ... جسے بعض جدید مفکرین 'کلاسیکی فقہ' کہہ دیتے ہیں... اس وقت کی ضرورت تھا، اسی کے تحت وجود میں آیا تھا، اس کی حیثیت لازمی [compulsory] کی نہیں تھی، اختیاری [optional] کی تھی، لہٰذا اس کی موافقت یا مخالفت دین میں کوئی بڑا موضوع نہیں۔ کہیں یہ طرزِ فکر ہے کہ آج کی واقعاتی صورتحال میں 'مجبوری [اضطرار]' اور 'ضرورت' کی کیفیت ہے، ایسے میں فقہی ذخیرے کی جزئیات سے 'مرجوح' اقوال پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ قاعدہ ہمارے فقہاء کے یہاں 'مسلّم' ہے، لیکن اس کا دائرہ آج اتنا بڑھا دیا گیا ہے کہ اکثر مسائل میں تلفیق[1] کی سی کیفیت بن جاتی ہے، اور کتنے ہی جوہری مسائل میں پوری تصویر بدل جاتی ہے۔ حالانکہ اس قاعدے کے ہمراہ یہ قواعد بھی فقہاء نے بیان کر رکھے ہیں کہ نہ محض 'کلیات' کو دیکھ کر اجتہاد کیا جاسکتا ہے، اور نہ محض 'جزئیات' کو دیکھ کر، بلکہ دونوں کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ پھر 'ضرورت' کے تعین میں بھی ہماری کم ہمتی اور کسل و عجز کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ یعنی ہم انقلاب اور تبدیلی کی محنت سے جی چراتے ہوئے ضرورت کا تعین کر رہے ہوتے ہیں، حالانکہ 'ضرورت' اور 'اضطرار' بھی فقہی اصطلاحات ہیں جن کا محل خود فقہائے امت واضح کر چکے ہیں۔

اس سب کے مقابلے میں امارتِ اسلامیہ کے زعماء، افغانستان کے اہلِ دین اور علمائے کرام اس مسئلے میں واضح ہیں۔ ان کے طرزِ فکر میں 'اجتہاد' اور 'تقلید' کی حدود واضح ہیں۔ دین کے وہ احکامات جو امامِ اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے شاگردوں رحمۃ اللہ علیہم نے مدون کیے ہیں، اور سابقہ صدیوں میں مذہبِ حنفی کے علمائے کرام نے متعین کیے ہیں، بالخصوص جبکہ امت کے عروج کے بیشتر سالوں میں مذہبِ حنفی ہی حکومتی سطح پر رائج تھا، امارتِ اسلامیہ انھیں اپنے لیے قابلِ اتباع سمجھتی ہے، اور آج کے جدید دور میں بھی ان مسائل سے متعلق اگر انھیں فقہی احکامات ملتے ہیں، تو انھی کے مطابق

[1] کسی ایک مسئلے کی مختلف جزئیات میں مختلف مذاہب سے الگ الگ رائے لینا، یہاں تک کہ مسئلے کی مجموعی شکل ایسی بن جائے جو کسی مذہب میں بھی جائز نہ ہو۔

عمل کرتے ہیں۔ ہاں! جہاں کہیں حقیقی ضرورت کی حالت پیش آجاتی ہے تو اس کے علاوہ دیگر مذاہب پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔ لیکن ان مسائل میں ہمارے فقہی ذخیرے کی مخالفت میں اجتہاد کا دروازہ بند رکھتے ہیں۔

یہاں ہماری بات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم مسلکِ تقلید کی بھرپور تائید کر رہے ہیں، اور موجودہ زمانے میں جو عرب دنیا میں سلفی تحریک موجود ہے، اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے، ہمارا بنیادی مقصد جو ہم واضح کر آئے ہیں، وہ قدیم مجتہدین کی پیروی کی طرف امت کو متوجہ کرنا ہے، اور ان قدیم مجتہدین کے اجتہادات کا خود کو پابند کرنا ہے۔ اب اگر کوئی گروہ... چاہے جس نام سے بھی ہو... ان قدیم مجتہدین کی آراء کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آج مسائلِ دینیہ میں اجتہاد کرتا ہے، تو اس کی روش ہمیں پریشانی میں مبتلا کرتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی گروہ اقرار تو اس کا کرے کہ وہ کسی خاص مذہب یا مذاہبِ فقہ کی تقلید کا پابند ہے، لیکن اس کے بعد موجودہ دور کے بہت سے مسائل میں قدیم مجتہدین کے اجتہادات کی من چاہی مخالفت کرتا رہے تو اس کا عمل اس کے اقرار کی یقیناً نفی کرے گا، اور اس سے مفسدے کا دروازہ بند نہیں کیا جاسکے گا۔ پس سلفی تحریک نے جہاں یہ روش اپنائی کہ قدیم مجتہدین اور مدون مذاہبِ فقہ کی مخالفت نہیں کی، بلکہ اس کی اتباع کو لازم سمجھا، پھر چاہے کسی ایک مذہب کی تقلید کو لازم نہ سمجھا، لیکن ایسا کرتے ہوئے 'تلفیق' سے بھی اپنے آپ کو بچایا تو الحمد للہ اس سے بھی خیر برآمد ہوئی، اس طرزِ فکر سے درست فکر کی تشکیل ہوئی اور ہمیں اللہ تعالی سے امید واثق ہے کہ اس روش کی حامل تحریک بھی ان شاء اللہ غلبۂ دین کی محنت میں ان شاء اللہ اچھے نتائج پیش کرے گی۔

فکر

اس سے قبل جو طرزِ فکر پر بات ہوئی، تو وہ دینِ اسلام کی بابت عمومی تھی جس کا تعلق دین کے ہر معاملے سے ہے، لیکن چونکہ یہاں ہمارا موضوع غلبۂ دین یا اقامتِ دین ہے، اس لیے یہاں صرف اسی بابت فکر کا بیان ہمیں مقصود ہے۔ سو جب ہم نے دیکھ لیا کہ امارت کے زعماء و مشائخ کے یہاں دینی احکامات کے اخذ کا ٹھیٹھ قدیم طرزِ فکر ہے تو نتیجتاً ان کے

یہاں غلبۂ دین کا بھی وہی تصور ہے جو بیسویں صدی میں کفار کے غلبے سے قبل تک تمام ادوار میں مسلمانوں کے یہاں رائج و مروج تھا... جس کی ابتداء خود دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی اور تین بڑی خلافتوں کے زمانوں میں دنیا میں عملاً رائج تھا۔ اس کے تصور میں پچھلی دو صدیوں کی مغرب کی اجارہ داری کو دخل نہیں ہے، نہ جمہوریت کے نظام کی پرچھائیاں اس فکر پر پڑی ہیں، نہ سوشلزم اور سرمایہ داری کے افکار نے اسے آلودہ کیا ہے، نہ وہ فرانس اور برطانیہ کے قوانین سے متاثر ہوئے ہیں، اور نہ ہی نیشن اسٹیٹس کے تصور نے انھیں الجھایا ہے۔ ان کے یہاں معاشرت، معیشت، سیاست، حکمرانی... ہر ایک میدان میں وہی فکر پائی جاتی ہے، جو عروج کی تیرہ صدیوں میں مسلمانوں میں موجود تھی، اور جسے انھوں نے علمائے امت کے علمی و فقہی ذخیرے میں لکھا ہوا پایا ہے۔

دین کے غلبے اور اقامت کے معانی ان کے یہاں اسلامی احکام، اسلامی شریعت کی تنفیذ ہے اور اس کے لیے صاحبِ قوت، صاحبِ اقتدار شخص کی تقرری ہے۔ قانون سازی کا مسئلہ ان کے یہاں بہت آسان اور سادہ ہے، کیونکہ ان کے یہاں قوانین وہ ہیں جنھیں مجتہدینِ اسلاف اور بعد کے فقہائے امت نے پہلے سے مدون کر دیا ہے۔ اس کے لیے وہ کسی قسم کے قانون ساز ادارے کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ یہ کام تو بیشتر ہو چکا ہے اور... بفضل اللہ... تدوین شدہ موجود ہے۔ قانون سازی تو ان لوگوں کا مسئلہ ہے جو اس کے لیے اللہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے، یا تسلیم کرتے ہیں تو اس کے اختیارات کو تسلیم نہیں کرتے، اور اسی وجہ سے اپنی اجتماعیت کے لیے خود اپنی مرضی کے قوانین بناتے ہیں۔ یہ مسئلہ اسلام اور مسلمانوں کا ہے نہیں۔ اور اسی وجہ سے امارت کے یہاں بھی یہ کوئی ایشو ہی نہیں ہے۔

ہاں! اگر کہیں چھوٹے سے دائرے میں جدید 'نوازل' میں اجتہاد کی ضرورت پڑے یا 'ضرورت' و 'اضطرار' کے سبب ترجیحِ آراء[1] کا اجتہاد کرنا پڑے تو ماہرینِ فن کی آراء کو لے کر علمائے کرام کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، چاہے وہ علماء کی جماعت

---

[1] مختلف مذاہب کی آراء میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دینا

شوریٰ میں ہو یا باہر ہو۔ اکثر علماء سے استفادہ کی کوشش کی جاتی ہے، بلکہ پوری امارت ہی علمائے کرام کی سرپرستی میں چلائی جاتی ہے۔ پھر اس دائرے کی قانون سازی کے لیے بھی ان کے یہاں دین کے متعین 'معیارات' ہیں، لہٰذا وہ کسی بھی جگہ فرانس یا برطانیہ کے قوانین کا حوالہ نہیں ڈھونڈتے، نہ ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

چنانچہ وہ بڑا جھنجھٹ جس کی وجہ سے 'روسو' جیسے فلسفیوں کو 'جمہوریت' جیسے نظریہ حکمرانی کے ایجاد کی ضرورت پڑی تھی، اور دینی احکام کو رد کر دینے کے بعد انسانی اجتماعیت کے قوانین کے خلاء کو پُر کرنے کے لیے 'قانون سازی' کی ضرورت پڑی تھی، اور اس قانون سازی کے 'معیارات' اور قانون سازی کرنے والوں کے 'اوصاف' کے تعین کی ضرورت پڑی تھی، یہ ہمارے یہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، اور نہ ہی ہے، اور نہ ہی ہونا چاہیے۔ الحمدللہ، امارت اس مسئلے میں واضح بھی ہے اور اس کا عمل بھی واضح ہے۔

جب قانون سازی کوئی مسئلہ نہیں رہا تو قانون سازی کرنے کے لیے عوامی نمائندوں کا انتخاب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ اس انتخاب کی ضرورت تو وہاں پڑتی ہے جہاں قانون سازی کا مقصد 'عوامی خواہشات' کی نمائندگی ہوتی ہے، اور اس کے لیے مختلف پارٹیاں اپنے نمائندوں کو سامنے لاتی ہیں تاکہ عوام کو بے وقوف بنائیں کہ وہی عوام کی خواہشات کی صحیح نمائندگی کریں گے۔ پھر عوام سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ مختلف نمائندوں میں سے کسی کو منتخب کریں کہ وہ قانون سازی کے عمل میں ان کی نمائندگی کرے۔ اسی وجہ سے معاشرے کے ایسے لوگ عوام میں متعارف کرائے جاتے ہیں جن کی پہلے سے کوئی دینی خدمت یا عوامی خدمت نہیں ہوتی، بلکہ وہ کچھ عرصہ حکومت کے مزے لینے کے لیے خطیر رقم خرچ کرتے ہیں، اور جھوٹ و فریب سے منتخب ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے ہی کمزور لوگ ہوتے ہیں جنھیں 'ڈیپ اسٹیٹ' یا 'بیرونی طاقتیں' کنٹرول کر کے اپنی مرضی کے قوانین نافذ کرواتی ہیں۔ الحمدللہ، امارت کے یہاں نہ قانون سازی کوئی مسئلہ ہے، اور جب قانون سازی کوئی مسئلہ نہیں تو قانون ساز اداروں کے نمائندوں کے انتخاب کی ضرورت نہیں ہے۔

حاکم کا انتخاب کیسے ہو اور حکومت کس طرز کی ہونی چاہیے؟ تو اس کے لیے امارت کے زعماء ’الأحکام السلطانیۃ‘ کے موضوع پر علمائے امت کی لکھی ہوئی کتب سے رجوع کرتے ہیں تو انھیں ایک ’امیر‘ [امیر المؤمنین] کے تعین کی تعلیم ملتی ہے، جسے معاشرے کے ’سربر آوردہ‘ لوگ منتخب کرتے ہیں۔ وہ لوگ منتخب کرتے ہیں جنھوں نے معاشرے میں دین کے غلبے کی حقیقی جدوجہد کی ہوتی ہے، اور اسی جدوجہد کے نتیجے میں معاشرے میں انھیں ’اشرافیہ‘ کا مقام ملا ہوتا ہے۔ یہ وہ ’مصنوعی‘ اشرافیہ نہیں ہوتی جو کسی ایسی جارح قوت کے ہاتھوں وجود میں آئے جس کا مقصد اسلام سے متصادم ہو، کجا یہ کہ ایسی اشرافیہ کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کا حاکم منتخب کریں۔

غلبۂ دین کی جدوجہد کے نتیجے میں معاشرے میں ابھرنے والی اشرافیہ ہی امیر المؤمنین کی ’مشیر‘ بھی ہوتی ہے اور انھی میں سے بعض مختلف اداروں اور وزارتوں کی سرپرستی کرنے والے بھی بنتے ہیں۔ ان لوگوں کے انتخاب کے لیے کسی قسم کے الیکشن کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ یہ تو معاشرے میں اپنی دینی وملی خدمات کی بدولت خود ’اہل الحل والعقد‘ کی سطح کو پہنچے ہوتے ہیں۔ اسلامی حکومت سازی میں یہ مرحلہ بہت اہم ہے، کیونکہ حاکم کا انتخاب اسی پر موقوف ہے۔ لہٰذا جب غلبۂ دین کے لیے قربانیاں دینے کے نتیجے میں کوئی شخص معاشرے میں ابھرتا ہے، تو دنیوی پیمانوں سے اس میں اطمینان زیادہ ہے کہ ایسا فرد اخلاص اور اہلیت... دونوں صفات سے متصف ہو گا۔ غلبۂ دین کی جدوجہد ہی وہ ’کسوٹی‘ ہے جس پر مفاد پرستی، اخلاص سے اور نااہلیت، اہلیت سے چھانٹی جا سکتی ہے۔ دنیا بھر کے نظمِ حکمرانی میں ایسی کوئی ’کسوٹی‘ نہیں پائی جاتی ہے۔

پھر انھی اہل الحل والعقد کے دو کام ہوتے ہیں؛ ایک امیر کا انتخاب، اور دوسرا انتظامی امور میں ’امیر‘ کو مشاورت کی فراہمی۔ چونکہ اسلامی حکومت کا سربراہ ’مؤقت‘ نہیں ہوتا، اسی لیے اہل الحل والعقد بھی ’مؤقت‘ نہیں ہوتے۔ ہر کچھ عرصے بعد نئے حکمران کے انتخاب کی ضرورت نہیں ہوتی، اور نہ ہی اس عمل کے لیے انتخاب کرنے والوں کی بار بار

ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں! مشاورت کا کام یہ لوگ ہمیشہ اور مستقل کرتے رہتے ہیں، اور خدمات [وزارتیں اور کابینہ] بھی بدلتی رہتی ہیں۔

اب جبکہ اہل الحل والعقد موجود ہیں تو امیر کا انتخاب کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔ اہل الحل والعقد اتفاقِ رائے سے کسی ایک فرد کو امیر منتخب کرلیتے ہیں۔ اس عمل کو اگر کوئی 'ووٹنگ' سے تعبیر کرے تو کوئی مسئلہ نہیں، اور پھر اس 'ووٹ' کو امانت، شہادت، وکالت سے تعبیر کرے تو بالکل ایسا ہی ہے۔ لیکن یہ ووٹنگ جمہوریت نہیں کہ یہ قانون سازی کے لیے ممبران کے انتخابی الیکشن سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی اور اس میں انتخاب کا اختیار ہر ایرے غیرے کو نہیں بلکہ اہل حل وعقد کو ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ مغرب نے غلبے کے بعد جس جمہوریت کو دنیا میں متعارف کروایا، اسے بزورِ قوت دنیا پر مسلط کیا، اور ایسا کرنے کے لیے کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اس جمہوریت کا اصل مقصد انتخابِ امیر نہیں ہے، بلکہ دینِ الٰہی سے 'آزاد' انسانی خواہشات کو دنیا میں غالب کرنا ہے۔ یہ کہنا کہ جمہوریت دراصل پر امن 'انتقالِ اقتدار' کا نام ہے، جمہوریت کی ناقص تصویر کشی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ پرامن انتقالِ اقتدار جس میں انسانی مرضی کی حاکمیت کو یقینی بنایا جائے۔ ورنہ اگر کہیں دنیا میں اس کے خلاف ہو تو یہی 'پرامن' انتقالِ اقتدار 'خونی' انقلاب کی لپیٹ میں آجاتا ہے، اور دنیا بھر کے جمہوریت پسند اس خونی انقلاب کی مشروعیت [legality] کو فوراً تسلیم کرلیتے ہیں، جیسا کہ الجزائر و مصر میں ہوا۔

بات دور چلی گئی۔ ہم یہ بتا رہے تھے کہ حکومت سازی کی جو تصویر ہمیں اسلامی تاریخ کے اوراق پر ملتی ہے، جو ہمیں فقہائے امت کی کتابوں میں ملتی ہے، اور جسے آج امارتِ اسلامیہ نے مسلمانوں میں زندہ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اہل الحل والعقد وہ لوگ بنتے ہیں جو غلبۂ دین کی جد وجہد میں استقامت سے ڈٹے رہتے ہیں، جن کی دینی خدمات مسلّم ہوتی ہیں، ان کے انتخاب کے لیے کسی الیکشن کی ضرورت نہیں ہوتی، انھیں اپنی تشہیر خود نہیں کرنی پڑتی، بلکہ معاشرہ انھیں خود مقام

دیتا ہے۔ پھر یہی لوگ امیر المؤمنین کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ سارا عمل دنیا میں اس وقت رائج نظمِ حکومت سے میل نہیں کھاتا، لہٰذا اس کی الگ حیثیت کو تسلیم کرنا چاہیے۔

اب جب امیر کا بھی انتخاب ہو گیا تو مسئلہ یہ آتا ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کیا ہیں۔ چنانچہ امیر کے فرائضِ منصبی بھی فقہاء نے واضح کر رکھے ہیں، تا کہ کوئی بھی مطلق العنان نہ بن جائے۔ لہٰذا یہاں کسی کو اعتراض کا موقع نہیں کہ یہ 'مطلق العنان' 'ڈِکٹیٹر شپ' ہو گی، کیونکہ ایک بات تو یہ ہے کہ اسلام میں 'امارت' ایک مسؤولیت ہے، کوئی مفادات کی شے نہیں ہے کہ کوئی اپنی مرضی کرنے لگے، اور دوسرا اس کے فرائض واضح ہیں، جن کی ادائیگی کے لیے ہی وہ منتخب ہوتا ہے۔ اور اس کا لبِ لباب دو باتیں ہیں؛ شریعت کی تنفیذ[1] کی یقین دہانی اور مسلمانوں کا دفاع۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسے 'جمہوریت' کا بنیادی مقصد الہامی تعلیمات سے آزاد انسانی خواہشات کی حامل قانون سازی کی تنفیذ اور اس کا دفاع ہے۔ افغانستان میں 'کابل ادارہ' آخر وقت تک 'قانونِ اساسی' کی مالا جپتا رہا، اور دنیا والے بھی... بشمول اسلامی ممالک... امارت کو اسی پر قانع کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہی حال اسلامی ممالک میں رائج جمہوریتوں کا بھی ہے۔

یہاں تک تو نظامِ حکومت اور خالص حکومت سازی کے عمل پر بات ہوئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ سارا عمل خلاء میں تو ہونا نہیں ہے، زمین پر ہو گا۔ جب زمین پر اس سارے عمل کے منافی نظام موجود ہو، چاہے کسی بھی نام سے ہو، تو اس عمل تک پہنچنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے، یعنی اقامتِ دین کے مرحلے تک کیسے پہنچا جائے۔ آج اسلامی تحریکوں کو سب سے زیادہ اسی مسئلے نے الجھایا ہوا ہے اور وہ اپنے معروضی حالات سے مجبور ہو کر مختلف راستوں اور طور طریقوں کو

---

[1] جب شریعت کی تنفیذ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد ہر میدانِ زندگی میں حکومتی سرپرستی میں شریعت کے احکامات کی پاسداری ہوتا ہے، اسلامی سزاؤں کا اجراء اس کا محض ایک جزو ہے۔ آج کے زمانے میں بعض لوگ شریعت کے نفاذ کو صرف حدود کے اجراء تک محدود تصور کرتے ہیں۔

اپنائے ہوئے ہیں۔ امارت کا طرزِ عمل اس معاملے میں بھی بڑا واضح رہا، دین کی تعلیمات کے بھی عین مطابق رہا اور عقل وخرد کے پیمانوں پر بھی پورا اترا۔

اوپر ہم نے جس نظامِ حکومت کی بات کی ہے، وہ نظامِ حکومت ہو یا دنیا کا کوئی بھی نظامِ حکومت ہو، اسی وقت وجود میں آتا ہے جب اس کے پیچھے قوت ہو، طاقت ہو۔ کوئی بھی تحریک اگر کسی نظامِ حکومت کو رائج کرنا چاہتی ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ مدِ مقابل نظام کے مقابلے میں اپنے اندر قوت پیدا کرے، اور اتنی قوت پیدا کرے جس کے بل بوتے پر وہ اپنا نظام رائج کر سکے۔ امیر المؤمنین ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ جو 'مؤسسِ تحریک' ہیں، انھوں نے ۹۰ء کی دہائی میں جب دیکھا کہ افغانستان میں ہر طرف 'وار لارڈز' کی حکومت ہے، اور ظلم وفسق پھیلا ہوا ہے، تو اس کے مقابلے میں نظامِ اسلامی کے قیام کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس کام کے لیے لوگوں کو جمع کرنا شروع کیا اور مقامی کمانڈانوں [وار لارڈز] کے خلاف جنگ لڑی۔ یوں ایک طرف اپنی قوت میں اضافہ کرتے چلے گئے اور دوسری طرف ظالموں کی قوت توڑتے گئے۔ یہ جنگ آپ کی طرف سے شرعی جہاد تھا، کیونکہ اس جنگ کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ تھا۔ جس جنگ کا بھی مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو اور وہ شرعی احکام کے مطابق ہو، تو اسے اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی جہاد کے نتیجے میں چند سالوں میں انھوں نے کابل فتح کیا، اہل الحل والعقد نے انھیں امیر المؤمنین کا خرقہ پہنایا اور امارتِ اسلامیہ وجود میں آگئی۔ پھر جب ۱۱ ستمبر کے حملوں کے بعد امریکہ نے افغانستان کو تہس نہس کر دیا، امارت کا سقوط ہو گیا تو اس وقت دوبارہ عالمی طاقتوں نے اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کو پیغام بھجوایا کہ افغانستان میں ہم نے جمہوریت رائج کر دی ہے، اگر آپ نظامِ اسلامی کے قیام کی جدوجہد کرنا چاہتے ہیں تو آجائیں، آپ بھی جمہوریت میں حصہ لیں اور اس کی کوشش کریں۔ لیکن آپ کے نزدیک مسئلہ واضح تھا۔ ایسی کوئی جدوجہد آپ رحمۃ اللہ علیہ کو فقہائے امت کے یہاں نہیں ملتی تھی، اسی لیے آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ہم اپنا جہاد جاری رکھیں گے۔ پھر بیس سالہ جہاد کے بعد آج ایک مرتبہ پھر امارتِ اسلامیہ قائم ہو گئی ہے، بفضل اللہ۔

یہاں کسی شخص کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ ان بیس سالوں میں افغانستان میں 'کافر' امریکہ جارح قوت کے طور پر موجود تھا، اس لیے اس خطے میں جہاد مشروع تھا۔ یہ ماڈل دوسرے اسلامی خطوں میں نہیں اپنایا جاسکتا۔ اس بات کا جواب کہ دوسرے اسلامی خطوں میں کیا کیا جائے، بعد میں ذکر کریں گے۔ فی الحال امارت کے طریقِ کار پر بات کرتے ہوئے عرض ہے کہ جس وقت ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ نے ۹۱ء میں جہاد شروع کیا تھا، اس وقت کوئی بیرونی جارح قوت نہیں تھی، بلکہ مسلمان وار لارڈز تھے۔ پھر حالیہ جنگ میں جب امریکہ کے ساتھ جنگ بندی ہوگئی اور صلح کا معاہدہ ہوگیا، اس کے بعد کوئی کافر قوت مقابلے میں نہیں تھی، بلکہ اشرف غنی کی سربراہی میں 'کابل ادارہ' تھا۔ اس وقت بعض لوگوں نے امارت کے قائدین سے یہی بات کہی کہ اب آپ کس دلیل سے جہاد کر رہے ہیں جبکہ امریکہ سے جنگ ختم ہوگئی ہے، آپ کو تو یہاں کے نظامِ جمہوریت میں شامل ہو کر اپنی جدوجہد کرنی چاہیے، تو انھوں نے واضح کہا کہ ہمارے جہاد کے دو مقاصد تھے؛ ایک امریکی جارحیت کا خاتمہ، اور دوسرا اسلامی نظام کا قیام، ابھی ایک مقصد پورا ہوا ہے، جبکہ دوسرا باقی ہے۔ جب تک دوسرا مقصد بھی پورا نہیں ہوتا، جہاد جاری رہے گا۔

اس سب سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد میں جہاد فی سبیل اللہ کا تصور امارت کے یہاں واضح ہے۔ وجہ یہی ہے کہ یہ تصور قرآن وسنت میں واضح ہے، فقہی متون میں واضح ہے، اسلامی تاریخ میں واضح ہے۔ 'آئینی' جدوجہد کا مسئلہ تو انگریز کی آمد کے بعد بیسویں صدی میں سامنے آیا، جب مسلمان مغلوبیت سے اس درجے مجبور ہوگئے کہ جہاد کی سکت باقی نہ رہی، تو اس وقت بعض علمائے امت نے 'اضطراری' حکم کے طور پر آئینی جدوجہد کے لیے 'جواز' کا فتویٰ دیا۔ یہاں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ فتویٰ آئینی جدوجہد کے جواز کا تھا، وجوب کا نہ تھا، دوسرے لفظوں میں ان علماء کا فتویٰ جہاد فی سبیل اللہ یا انقلابی عسکری جدوجہد کی حرمت یا عدمِ جواز کا نہ تھا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ ہماری دینی تعلیمات اور فقہائے امت کی کتب اس موضوع سے متعلق احکامات سے بھری پڑی ہیں، جہاں کفار کے خلاف جہاد کے ساتھ ساتھ مفسدوں، ظالموں، باغیوں، محاربوں کے خلاف جہاد و قتال کے احکامات موجود ہیں۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ دونوں طرح کے جہاد کے احکامات مختلف ہیں۔ یہاں تو ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ جب زمین پر نظامِ اسلامی کے قیام کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا کوئی بھی نظام موجود ہو... چاہے اس کے چلانے والے جس نام سے بھی ہوں...، تو اس کے خلاف 'قوت' جمع کرنا اور پھر 'قوت' کے ساتھ اس نظام کو ختم کر کے اسلامی نظام رائج کرنا، یہ امارت کا طرزِ عمل رہا اور یہ طرزِ عمل فقہائے امت کی تعلیمات کے مطابق تھا۔

ہم اپنی بات کو مزید واضح کرتے چلیں کہ شاید ہماری بات سے کسی کو یہ ابہام ہو کہ ہم ہر اس خطے میں... جہاں اسلامی نظام قائم نہیں ہے... فوری اسلحہ اٹھا کر مسلح جدوجہد کی دعوت دے رہے ہیں۔ نہیں! ہمارے ساتھ عجلت نہ کیجیے، بلکہ ہماری بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ہم تو یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے مقابل نظام سے 'آزاد'، 'قوت' کی فراہمی ناگزیر ہے اور وہ قوت بھی اسی وقت کہلاتی ہے جب وہ 'عسکری' قوت ہوتی ہے، کیونکہ ایسی آزاد قوت ہی کسی بیرونی اثر سے محفوظ رہ کر مکمل اسلامی نظام یا امارتِ اسلامیہ قائم کر سکتی ہے۔ یہ ہمارا بنیادی نکتہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس قوت کی فراہمی کے لیے کیا کیا جائے؟ شاید کوئی سمجھتا ہو کہ آئینی جدوجہد کر کے بھی یہ قوت فراہم کی جاسکتی ہے۔ ہم ایسے فرد کو روک تو نہیں سکتے، لیکن اسے اس کے اپنے تجربے سے استفادہ کرنے کا ضرور کہہ سکتے ہیں، کہ آج کے جدید دور میں ابھی تک کسی ایسی جدوجہد سے کوئی قوت میسر نہیں آسکی ہے جو اسلامی نظام قائم کر سکی ہو، بلکہ آئینی جدوجہد والے تو پر امن جدوجہد کرتے ہیں، محض لوگوں کو جمع کرتے ہیں، انھیں مسلح تک نہیں کرتے کہ وقت آنے پر وہ کسی مقابل قوت کا مقابلہ کر سکیں، الٹا مسلح جدوجہد سے ہمیشہ روکتے ہیں۔ نتیجتاً یہی ہوتا ہے کہ آئینی جدوجہد میں یہ اکثریت بھی حاصل کر لیں تو ملکی افواج... جو عسکری قوت کی حامل ہوتی ہیں... ان کا تختہ الٹ دیتی ہیں، بلکہ ان میں سے بعض کو تختہ دار تک بھی پہنچا دیتی ہیں[1]، اور اتنی بھاری اکثریت وہیں ڈھیر ہو جاتی ہے۔

---

[1] اللہ تعالیٰ مصر کے صدر مرسی پر رحم فرمائیں اور انھیں ان کی نیکیوں کا اچھا صلہ دیں، آمین۔

لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غلبۂ دین کی تحریک کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے قوت کی فراہمی کا راستہ ڈھونڈیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلم خطوں میں ابتداء ہی سے کوئی بھی غلبۂ دین کی تحریک اسلحہ اٹھالے اور غالب نظام سے لڑنا شروع کردے۔ ظاہر ہے کہ بغیر بھرپور تیاری کے جنگ کا نتیجہ ایسے مجاہدین کی شکست اور اس ملک میں مسلمانوں کی زبوں حالی میں اضافہ کی شکل میں برامد ہونا اغلبی ہے۔ مسلح جدوجہد کے آغاز کے لیے اس وقت تک اقدام مفید نہیں ہوتا، جب تک اپنے غالب گمان میں غلبے کے عوامل پورے نہ کرلیے جائیں۔ اس لیے اس سے قبل افراد کو اسلامی نظام کے قیام کے نظریے پر جمع کرنا، مختلف طبقات اور مختلف میدانِ عمل کے افراد کو جوڑنا، کسی بھی ملک میں سیاسی طور پر اپنے آپ کو مضبوط کرنا، اپنے افراد میں جہاد و قتال کے معانی زندہ کرنا... تاکہ جب آپ کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھ کر نظام آپ کے خلاف متحرک ہو تو اس کے خلاف جہاد و قتال شروع کردینا... یا تیاری بھی پوری ہوجائے اور سیاسی اسباب بھی پیدا ہوجائیں تو خود اقدام کرلینا۔ یہ سارا کام آئینی جدوجہد میں شمولیت سے 'فلاپ' ہوجاتا ہے۔ ہاں! آئینی جدوجہد پر 'اصرار' کرنے والے افراد کو بھی اس منصوبے میں شامل رکھنا یقیناً مفید ہے، تاکہ وہ بھی اس بڑی تحریک کی تائید میں اپنی جدوجہد کریں، اور غلبۂ دین کی جدوجہد کرنے والوں میں کوئی مخالف آواز نہ رہے۔

عمل

ابھی تک ہم نے امارت کے یہاں طرزِ فکر اور ان کی فکر پر بات کی ہے، عمل پر بات ابھی کرتے ہیں۔ جہاں ہم نے نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے جہاد کرنے کی بھی بات کی ہے تو وہ بھی فکر کے ضمن میں کی ہے، کیونکہ اسلامی نظریات میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے جہاد فی سبیل اللہ ایک 'مشروع' عمل ہے۔ فکر ایک شے ہے اور عمل دوسری شے ہے۔ کسی کے یہاں فکر کا پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ عمل بھی موجود ہو، بایں ہمہ کسی کے 'مفکر' ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ 'ساعی' بھی ہو۔ ہاں! فکر ضرور عمل کا پیش خیمہ ہوتی ہے، مگر اسے عمل کی دنیا میں لانے والے مزید عوامل ہوتے ہیں۔

غلبۂ دین کی جدوجہد کو عملی شکل دینے کے لیے درست فکر کے بعد جو عوامل درکار ہیں، اور جنھیں یہاں ہم اپنے فہم کے مطابق اپنے لفظوں میں تعبیر کر رہے ہیں؛ وہ ہیں ایمان، توکل اور پھر صبر واستقامت۔ غلبۂ دین کی جدوجہد کسی بھی سطح پر ہو، کوئی آسان اور سہل کام نہیں ہے، بلکہ مشکلات اور مصائب سے پُر اِک کٹھن راستہ ہے۔ جس کے کبھی پہلے قدم پر ہی آزمائش شروع ہو جاتی ہے، اور اگر کہیں شروع کے قدموں پر نہ آئے تو بعد میں تو آنا ناگزیر ہوتا ہے۔

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ﴾ ﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَـوۡفِ وَالۡجُـوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ﴾ ﴿وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ‌ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا﴾۔

اس راستے پر اس وقت تک کوئی ابتداء نہیں کر سکتا جب تک کہ 'قوتِ ایمانی' سے سرشار نہ ہو جائے، اس کے اندر اپنے دین پر غیر متزلزل یقین نہ ہو، وہ اس دین کے لیے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار ہو، ہر قربانی دینے کے لیے آمادہ ہو، اس کے دل میں دین سے والہانہ لگن ہو، اس کے دل میں دین کے غالب کرنے کی تڑپ ہو ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ ﴿اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ يَّقُوۡلَ رَبِّىَ اللّٰهُ﴾۔ اس وقت اسلامی دنیا پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو افغان قوم سب میں ممیز نظر آتی ہے، کہ بحیثیتِ قوم ان میں دین سے لگن اور محبت ہر دوسری قوم سے زیادہ ہے۔ جب قوم کا یہ حال ہے تو اس کے مجاہدین کی قیادت کا کیا عالم ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ امارت اسلامیہ کے ہر مجاہد اور ہر کارکن کی نگاہ میں ایک ہی منزل ہے، اور وہ ہے دینِ اسلام کا قیام اور شریعت کا نفاذ۔ وہ اس منزل کے حصول تک پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔

اس کے بعد جو چیز درکار ہے، وہ اپنے رب پر 'بھروسہ' ہے، 'توکل' ہے۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل محض مصالح ومفاسد کا موازنہ کر لینا کافی نہیں ہوتا، کیونکہ تقدیر تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، نہ انسانی تدبیر خود مستقل ہے، نہ اس کی عقل کارساز ہے، بالآخر وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اس لیے خوب سوچ وبچار کرے، لیکن پھر خدشات کو خاطر میں نہ لائے، اسباب کی کمی پر پریشان نہ ہو، بلکہ جو اسباب دستیاب ہوں، ان کے حوالے سے بھی اور جو اسباب میسر نہ ہوں، تو ان کے حوالے سے بھی، ہر حوالے سے تدبیر سے قبل اپنے آپ کو اور اپنی محنت کو اپنے رب کے سپرد کر دے، تفویض

کر دے۔ یہ 'توکل' ہے جس کے بغیر غلبۂ دین کی محنت عملی شکل نہیں اختیار کر سکتی۔ اس اسباب سے بھری دنیا میں اگر انسان کی نظر محض اسباب پر پڑ جائے اور مصالح و مفاسد کے موازنوں میں اس کا ذہن الجھا رہے تو غلبۂ دین کی محنت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اللہ کی سنتِ کونیہ ہے کہ وہ باطل کو خوب ساز وسامان دیتے ہیں، اور اس کے مقابلے میں حق کو بے سرو سامانی کی حالت میں مقابلے کے لیے کھڑا کرتے ہیں۔ ﴿حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا﴾ ﴿حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾ اور پھر اس بے سروسامانی میں توکل کی قوت کے بل پر اہلِ حق معرکہ حق و باطل لڑتے ہیں، اور کمزوری سے قوت اور قلت سے کثرت کی منزل طے کرتے ہیں، ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾۔ لہٰذا غلبۂ دین کی جدوجہد میں عقل و خرد کا استعمال ناگزیر، مگر فیصلہ کن عامل [decisive factor] اپنے اللہ تعالیٰ پر 'توکل' ہے۔ ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ ﴿وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا﴾۔ آج کے دور میں ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت تو 'توکل' کے باب میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور آپ کا پرَتو آپ کے قریبی رفقاء اور پوری تحریک پر نمایاں ہے۔ ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب انھوں نے تحریک شروع کی تو بس 'توکلِ محض' کیا۔ کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہ تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ جڑتے گئے اور وہ بڑھتے گئے۔

توکل کے بعد تیسری چیز جو آتی ہے، وہ ہے 'صبر و استقامت'۔ جب توکل کر کے غلبۂ دین کی محنت شروع کر دی تو پھر اب حالات جیسے بھی ہو جائیں، مصائب جس درجے بڑھ جائیں، سختیاں آسمانوں کو چھونے لگیں، بندہ مومن ڈٹ جائے، صبر کرے، ثابت قدم رہے اور استقامت دکھائے۔ راستہ چھوڑ دینا یا بدل دینا اس کے یہاں آگ میں کود جانے کے مرادف ہو۔ ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا﴾ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾ ﴿اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ

﴿فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾۔ امارتِ اسلامیہ کے پہلے دور میں ہر طرف سے ان پر پابندیاں عائد رہیں، قحطِ سالی کا سامنا ہوا، شمالی اتحاد کے ساتھ مستقل جنگ رہی، ساری دنیا کی مخالفت جھیلنی پڑی، مگر ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے ساتھی اور امارتِ اسلامیہ ڈٹی رہی، اپنے دین پر سودا بازی نہیں کی، شریعت کے احکامات سے روگردانی نہیں کی، ایک شیخ اسامہ بن لادن رحمۃ اللہ علیہ کے معاملے میں دین کے 'ایک' حکم کی مخالفت بھی نہ کی۔ پھر امریکہ، نیٹو کی افواج کے ساتھ حملہ آور ہوا، اور دنیا کی سب سے بڑی قوت لے کر افغانستان آیا، کسی ملک نے امارت کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ جنھوں نے پہلے امارت کی رسمیت تسلیم کی تھی، انھوں نے بھی غدر کیا۔ لیکن ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ پھر ڈٹ گئے، اللہ کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے پھر توکل کی روش اپنائی، اور ہر مصیبت کے مقابلے میں صبر کی راہ لی۔ دربدری کا سامنا ہوا، شہادتوں اور گرفتاریوں سے گزر ہوا، لیکن پورا کاروان ڈٹا رہا، اپنے مبادی سے تنازل نہ کیا، بلکہ دوبارہ جہاد و قتال کے لیے نکل پڑے۔ اور آج بیس سال بعد یہ دنیا کے سامنے کامیاب و کامران کھڑے ہیں۔ وہ امارت جسے امریکہ نے اپنے مغربی اور مقامی حواریوں کے ذریعے گرایا تھا، آج پہلے سے زیادہ آب و تاب کے ساتھ پورے افغانستان پر اسلامی نظام قائم کر رہی ہے، افغانستان کے چپے چپے پر شریعت کا نفاذ عمل میں آرہا ہے۔ آج ایک اسلامی سلطنت کی بنا پڑ رہی ہے۔ ساری دنیا میں واحد اسلامی سلطنت۔ وہ واحد غلبۂ دین کی تحریک جس نے تمام مراحل کامیابی سے پورے کیے اور تمکین کی منزل پر سرفراز ہوئی۔

عمل میں بھی یہ ساری دنیا کی تحریکات کے لیے مثال ہے، کہ جب نعرہ اتنا بلند ہم نے لگایا ہے، تو محنت بھی اتنی ہی بلند درکار ہے۔ نظر و افکار کی بلندی کے لیے کردار کی بھی اتنی ہی بلندی درکار ہے۔ اور بلند محنت اور عالی کردار کے لیے ایمانی قوت، توکل اور پھر صبر و استقامت درکار ہے۔ اس کے بغیر منزل کا حصول ناممکن ہے۔ اس کے بغیر غلبۂ دین کے راستے پر قدم نہیں رکھا جا سکتا۔ اور اگر کوئی رکھ لے تو یا مایوس ہو کر راستہ ہی چھوڑ بیٹھتا ہے، یا 'تراجعات' اور 'تنازلات' پر مجبور ہو کر راستہ بدل لیتا ہے، اور یا پھر باطل کے ساتھ مفاہمت کر لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر اس فرد کو جو غلبۂ دین کی عظیم محنت کرنا چاہتا ہے یا کرنے نکلا ہے، اس انجامِ بد سے محفوظ رکھے۔

اللہ تعالیٰ عملِ اسلامی سے وابستہ ہر بھائی اور ہر تحریک کی درست سمت کی طرف رہنمائی فرمائیں، دین پر ثابت قدم رکھیں، دین کے مفاہیم کی ہمارے ذہنوں میں تصحیح فرمادیں، ایمان اور صبر وتوکل کی صفات ہم میں پیدا فرمادیں، اور ہم سے اپنے دین کی خدمت قبول فرمالیں، آمین۔

یہ چند گزارشات تھیں جو ہم نے چاہا کہ امارت اسلامیہ کی فتح اور بحالی کے موقع پر اپنے ان تمام بھائیوں کے سامنے رکھیں جو کسی بھی سطح پر غلبۂ دین کی محنت سے جڑے ہوئے ہیں، کوئی مدارس اور جامعات میں تدریسِ دین میں مشغول ہے، کوئی خانقاہی محنت کر رہا ہے، کوئی دعوتی میدان میں اکیلا منبر لگائے ہے یا کسی دعوتی جماعت سے جڑا ہے، کوئی دینی سیاسی جماعتوں کا رکن ہے یا کوئی اس راہ میں جہاد وقتال کی صفوں میں موجود ہے۔ ہمیں ہر ایک بھائی اپنے سے بڑھ کر عزیز ہے، ان کی محنت ہمیں عزیز ہے، ہم سب کو ایک ہی جسم کا حصہ سمجھتے ہیں، سب کو ایک ہی غم میں شریک سمجھتے ہیں۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم سب کی محنت ایک ہی سمت میں چلے اور جس طرح ایک خطے میں غلبۂ دین تمکین کے مرحلے تک پہنچا ہے، دیگر خطوں میں بھی تمکین سے سرفراز ہو اور اسلامی بہاریں حقیقت کا روپ دھار لیں۔ بس امارت اسلامیہ ہم سب کی امارت ہے، رہنما ہے، سب کے لیے نمونہ ہے۔ ہم سب مل کر اسے مضبوط کریں، اور اس سے سبق حاصل کر کے اپنے اپنے خطوں میں اپنی محنت اور سعی کو درست سمت میں آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کے حامی وناصر ہوں، آمین۔

إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت وإليه أنيب۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين، وصلى الله تعالىٰ على نبينا الأمين۔